اس کتاب میں نظر آئے گی۔ آپ اس میں دیکھیں گے کہ معمولی علم و عقل والے نہیں، بلکہ سلطنتوں کے سفراء، علوم جدیدہ کے ماہرین، اعلیٰ درجہ کے مصنفین اور اخبار نویس، حتیٰ کہ غیر مذاہب کے پیشوا اور مبلغین بھی جب اسلام سے روشناس ہوئے اور اس کی اصلی صورت ان کو نظر آگئی تو کس طرح وہ اس کے شیدائی ہو گئے، اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگیوں کو اس دین کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ اس قسم کی ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مثالیں مصنف نے بیان کی ہیں اور ایک ایک ملک کو لے کر بتایا ہے کہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ محض اپنی روحانی قوت سے کس طرح وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف نے تفصیل کے ساتھ جماعت احمدیہ کی تبلیغی کارروائیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا ہے۔

مسلمان اور سائنس تالیف خان بہادر محمد ذکاء اللہ خان صاحب۔ ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ کلکٹر و نائب ریاست دتیا قیمت ۴ر ملنے کا پتہ لطیفی پریس، دہلی۔

یہ کتاب اس سے پہلے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ مگر وہ اشاعت ناقص تھی۔ اب مؤلف نے بہتر کتابت و طباعت کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔

فاضل مصنف ایک دردمند اور مخلص مسلمان ہیں۔ انہوں نے یہ رسالہ اس مقصد کے لیے لکھا ہے کہ علمائے کرام کو قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح، اور علوم جدیدہ، خصوصاً سائنس، کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ مقصد بجائے خود صحیح ہے، اور ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے ارباب حل و عقد اس رسالہ کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کریں۔ لیکن ہمیں مصنف کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ علمائے نفس علوم جدیدہ کے مخالف ہیں، اور ان علوم کو دہریت و الحاد پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مصنف کو غالباً معلوم ہوگا کہ علمائے ہند کے سرخیل حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس زمانہ میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب سر سید احمد خان شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے

اور ہندوستان میں کسی شخص کو اس ضرورت کا احساس نہ تھا۔ شاہ صاحب کی دوررس نگاہوں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان پر ایک حکیم قوم مسلط ہو رہی ہے اور حکیم کا مقابلہ حکمت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے غدر سے پہلے دہلی کالج میں جب علوم جدیدہ کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی تھی تو علماء میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو حکمت کی تعلیم سے کبھی اختلاف نہ تھا نہ آج ہے۔ اصل چیز جس کے وہ مخالف تھے اور آج بھی مخالفت پر مجبور ہیں، وہ طرز تعلیم ہے جو انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے لیے رائج کیا ہے۔ ابتداءً جدید تعلیم تمام تر عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھی، اور سرکار برطانیہ کی سرپرستی میں انہوں نے بیسیوں زنانہ و مردانہ تعلیمگاہیں صرف اس غرض کے لیے جاری کی تھیں کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی نہ بنایا جا سکے، تو کم از کم اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بیگانہ بنا دیا جائے، اور ان کے دلوں میں فرنگی تہذیب کی عظمت اور فرنگی اقتدار کی غلامی کا گہرا نقش بٹھا دیا جائے۔ اس کے بعد جب خود حکومت نے تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو جدید تعلیمی پالیسی کا سنگ بنیاد میکالے کے اس تخیل پر رکھا گیا کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی "جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو گی، مگر مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز ہو گی"۔ اس پالیسی کے تحت جتنے مدارس اور کالج قائم ہوئے ان کا اصل مقصد باشندگان ہند کو زیور علم سے آراستہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کے دل و دماغ کو انگریزی اقتدار کی غلامی کے لیے تیار کرنا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان تعلیمگاہوں میں مسلمانوں کے خلاف تو ایسی سخت زہریلی فضا پیدا کی گئی تھی کہ کوئی خوددار مسلمان اس میں سانس نہ لے سکتا تھا۔ ان کے اسلاف پر تبرا بھیجا جاتا تھا۔ ان کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد کی تردید ہوتی تھی۔ ان کی تہذیب کا مذاق اڑایا جاتا تھا؛ اور اس کے ساتھ ہر ممکن ذریعہ سے کوشش کی جاتی تھی کہ اسلامی علوم و فنون دنیا سے مٹ جائیں، عربی و فارسی کی تعلیم بند ہو، اور اسلامی علوم پڑھنے والوں

کے لیے رزق کے دروازے مسدود ہو جائیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ علماء اس تعلیمی پالیسی کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہ تھے؟

انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی اس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علیگڑھ اور دوسری اسلامی درسگاہوں میں اختیار کیا گیا وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریزی حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علماء نے اس بنا پر کبھی نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں پڑھائی جاتی ہے، یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ بلکہ مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی، اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس و اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل مصنف کی طرح ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ علوم جدیدہ میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو اسلام کا مخالف ہو۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم، حتیٰ کہ فلسفہ میں بھی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو اسلام کے اصول و فروع میں سے کسی کی تردید کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ سب علوم دراصل مسلمان کے ایمان میں اضافہ کرنے والے اور اسکو خلافت الٰہی کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے والے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جدید درسگاہوں میں ——— خواہ وہ قومی ہوں یا سرکاری ——— ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۵ فی صدی مسلمان طلبہ کی مت کیوں پلٹ جاتی ہے؟ وہ ہندوستانی مسلمان سے یکایک "صاحب بہادر" کیوں بن جاتے ہیں؟ ان کی لڑکیاں خاتون مشرق سے یکلخت "میم صاحب" کیوں بن جاتی ہیں؟ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کی معاشرت، ان کے عادات و اطوار پر فرنگیت کیوں مسلط ہو جاتی ہے؟ ان کے دماغ اپنے دین کی صداقت میں کیوں شک کرنے لگتے ہیں؟ ان کے

اندر حدود شریعت سے آزادی کا مرض کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ وہ نماز سے کیوں گریزاں ہوتے ہیں؟ رمضان میں علانیہ کھانے پینے اور سگریٹ کے دھوئیں اڑانے کی جرأت ان میں کیوں پیدا ہوتی ہے؟ شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور عقائد اسلامی کے خلاف زبان کھولنے پر وہ کیوں جری ہو جاتے ہیں؟ آخر وہ کونسی چیز ہے جو طبیعیات اور فلسفہ کے طالب علم کو دہریہ بناتی ہے؟ عمرانیات کے طالب علم کو اسلام سے ہٹا کر سرمایہ داری یا اشتراکیت کی طرف لے جاتی ہے؟ تاریخ و سیاسیات کے طالب علم کو رنگ و نسل و وطن کی پرستش کا سبق سکھاتی ہے؟ قانون کے طالب علم کو اسلامی قوانین میں جاہلانہ ترمیمیں کرنے پر آمادہ کرتی ہے؟ اور مشترک طور پر تمام علوم جدیدہ کے طالب علموں میں یہ مرض تھوڑا یا بہت پیدا کر دیتی ہے کہ ان پر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر غالب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز کی قدر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کے لحاظ سے متعین کرنے لگتے ہیں؟ اگر آپ حکیمانہ نظر سے ان خرابیوں کے اسباب کا تجسس کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ محض سطح کا میل کچیل نہیں ہے جو اوپر نئے مسلمان نوجوانوں کو لگ جاتا ہو بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ اس غلط طرز تعلیم اور ناقص طریق تربیت میں نشو و نما پا رہی ہیں جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ علماء اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے، بلکہ وہ اسلام کے دشمن ہوں گے اگر اس کی حمایت کریں گے۔

پس درحقیقت علماء پر اس حیثیت سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علوم جدیدہ کی تعلیم کے موجودہ طرز کے مخالف ہیں، بلکہ ان پر الزام ایک دوسری حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ وہ اس بنا پر ملزم اور سخت ملزم ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کو سمجھنے اور قدیم طرز تعلیم کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے اردگرد ساتویں صدی ہجری کی فضا طاری کر رکھی ہے جس میں العالم متغیر وکل متغیر حادث کا سبق تو روز دیا جاتا ہے مگر اس کی حقیقت

تسلیم کرنے سے ہرآن انکار کیا جاتا ہے۔ وہ آج تک اُن فرق باطلہ کا رد کیے جارہے ہیں جو اب دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں، اور آج جو نئی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو سمجھنے تک کی اہلیت اپنے اندر پیدا نہیں کرتے، کجا کہ ان کا رد کر سکیں۔ ان کی زبان پرانی، ان کے خیالات پرانے، ان کی حجتیں پرانی، ان کی حرکات و سکنات پرانی، غرض مجموعی حیثیت سے وہ خود اس قدر پرانے ہیں کہ دنیا آج ان کو آثار قدیمہ میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔ جدید زمانے کی زندگی میں وہ اس کے سوا کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے کہ لوگ ان کو اسلام کا نمائندہ سمجھ کر خود اسلام سے بدگمان ہو جائیں۔ ان میں اتنی ایسے لوگ موجود ہیں جو اخبار تک پڑھنا پسند نہیں کرتے کہ مبادا العالم متغیر کی حقیقت ان پر منکشف نہ ہو جائے۔ فاضل مصنف تو ان پر صرف علوم جدیدہ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ خود اسلامی علوم کی تعلیم بھی جو ان کے مدرسوں میں دی جارہی ہے، شدت کیساتھ محتاج اصلاح ہے۔ درحقیقت وہ اس قدر ناقص ہے کہ اس کے انتہائی مدارج پر پہنچ کر بھی انسان روح اسلامی سے بیگانہ رہتا ہے، اور اس میں اسلام کو سمجھنے تک کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی، کجا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرز تعلیم کے نقائص بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ ایک مستقل مضمون عربی مدارس کی تعلیم پر بھی اسی طرح لکھا جائے گا جس طرح علیگڈھ یونیورسٹی کی تعلیم پر لکھا جا چکا ہے۔

خاتمہ تالیف حضرت سید محمد گیسو دراز چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے۔ سی، ای، لنگم پلی حیدرآباد دکن۔

"آداب المریدین" تصوف کی مشہور کتابوں میں سے ہے حضرت خواجہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تین شرحیں لکھی تھیں، اور ان میں سے ایک شرح کے آخر میں تکملہ یا ضمیمہ کے طور پر یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کا نام "خاتمہ" ہے۔ اس میں حضرت نے تفصیل کے ساتھ وہ ہدایتیں درج فرمائی